مقالات اقبالؒ

مرتبہ

سیّد عبدالواحد معینی
محمد عبداللہ قریشی

القمر انٹرپرائزز
غزنی سٹریٹ
اُردو بازار ۰ لاہور

خوبصورت، معیاری کتابیں

الفمر انٹر پرائزز

اہتمام: محمد سعید الرحمن صدیقی

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

طبع: ۲۰۱۱ء

مطبع: عرفان افضل پرنٹرز لاہور

قیمت: روپے

(۷)

ملّتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر

انسانی تاریخ کے پارینہ اوراق کو اُلٹتے وقت جب ہماری نظر ارتقا کی الم ریز جھلملیوں میں سے چھنتی ہوئی ان کے رزمیہ بین السطور پر پڑتی ہے تو کسی خواب کے گریز پا نظاروں کی طرح ہم گزری ہوئی قوموں، سلطنتوں اور تمدنوں کے کھنڈرات کے پے بہ پے نیست سے ہست، اور ہست سے نیست ہوتا دیکھتے ہیں جس سے زیادہ ہیبت افزا اور حوصلہ فرسا منظر اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ قدرت کی قوتوں کی نظروں میں نہ افراد کی وقعت ہے نہ اقوام کی منزلت۔ اس کے اٹل قوانین برابر اپنا عمل کئے جا رہے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا اس کی منزلِ مقصود بہت ہی دُور ہے جسے مقاصدِ انسانی کے آغاز و انجام سے کسی قسم کا تعلق نہیں لیکن

آدمی زادہ طرفہ معجونیست

باوجود حالات گرد و پیش کی ناموافقت کے اس کی تخیل جو عقل کی آئینہ بردار ہے اسے اپنی ہستی کا کامل تر جلوہ دکھا دیتی ہے اور ان ذرائع کی دریافت پر آمادہ کرتی ہے جو اس تصویر مثالی میں جس کے خط و خال اس کی شانِ اکملیت کو چھپائے

ہوئے ہیں جان ڈال سکیں۔ دوسرے حیوانات کے مقابلہ میں انسان بہت ہی کمزور و ناتواں ہے۔ اپنے بچاؤ کے لئے وہ قدرتی حربوں سے مسلح نہیں کیا گیا۔ وہ بصارتِ شبینہ سے محروم ہے۔ اس کی قوت شامہ اور طاقتِ گریز بہت کم ہے۔ لیکن پھر بھی زندگانی کی آزادیوں اور پنہائیوں کی جستجو میں اُس نے اپنی انتھک سرگرمیوں کو ہمیشہ سے وقف کئے رکھا ہے تاکہ قوانینِ قدرت کی کہنہ اور طرزِ عمل سے واقف ہو کر وہ رفتہ رفتہ ان اسباب پر حاوی ہو جائے جو خود اس کے ارتقا پر مؤثر ہیں۔

قانونِ انتخابِ فطری کے اکتشافِ عظیم کی بدولت انسان اپنے خانوادہ کی تاریخ کا عقلی تصور قائم کرنے کے قابل ہو گیا۔ حالانکہ پہلے اس تاریخ کے واقعات کی حیثیت اس کے نزدیک حوادث کے ایک فوق الادراک سلسلہ سے زیادہ نہ تھی جو بلا کسی اندرونی ترتیب یا غایت کے فرداً فرداً مادرِ ایام کے سراپا اسرار بطن سے پیدا ہو کر گہوارۂ شہود میں اٹھکیلیاں کرتے ہوئے نظر آیا کرتے تھے۔ اس قانون کے معانی کی تنقید جب اور بھی زیادہ دقتِ نظر کے ساتھ کی گئی اور ان فلاسفہ نے جن کی خیال آفرینیاں ڈاروِن کے مقدمہ حکمت کا تتمہ ہیں، حیاتِ حیات کی ہیئت اجتماعی کے دوسرے نمایاں حقائق کا انکشاف کیا تو مدنی زندگی کے عمرانی، اخلاقی، اقتصادی اور سیاسی پہلوؤں کے متعلق انسان کے تصورات میں ایک انقلابِ عظیم پیدا ہونے کی صورت نکل آئی۔

علم الحیات کے اصولوں نے حال ہی میں اس حقیقت پر روشنی ڈالی ہے کہ فردِ فی نفسہٖ ایک ہستیٔ اعتباری ہے یا یوں کہئے کہ اس کا نام ان مجرداتِ عقلیہ کی قبیل سے ہے جن کا حوالہ دے کر عمرانیات کے مباحث کے سمجھنے میں آسانی

پیدا کر دی جاتی ہے۔ بالفاظ دیگر فرد اس جماعت کی زندگی میں جس کے ساتھ اس کا تعلق ہے بمنزلہ ایک عارضہ اور آنی لمحہ کے ہے۔ اس کے خیالات، اس کی تمنائیں اس کا طرز ماند و بود اس کے جملہ قوائے دماغی و جسمانی بلکہ اس کے ایّام زندگانی کی تعداد تک اس جماعت کی ضروریات و حوائج کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے۔ جس کی حیاتِ اجتماعی کا وہ محض ایک جزوی مظہر ہے۔ فرد کے افعال کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں کہ وہ بر سبیلِ اضطرار و بلا ارادہ کسی ایک خاص کام کو جو جماعت کے نظام نے اس کے سپرد کیا ہے۔ انجام دے دیتا ہے اور اس لحاظ سے اس کے مقاصد کو جماعت کے مقاصد سے تخالف کُلّی بلکہ نزاعِ مطلق ہے۔ جماعت کی زندگی بلا لحاظ اپنے اجزائے ترکیبی یعنی افراد کی زندگی کے بالکل جداگانہ ہوتی ہے اور جس طرح ایک جسم ذوی الاعضا مریض ہونے کی حالت میں بعض دفعہ خود بخود بلا علم و ارادہ اپنے اندر ایسی قوتوں کو برانگیختہ کر دیتا ہے جو اس کی تندرستی کا موجب بن جاتی ہیں۔ اس طرح ایک قوم جو مخالف قوتوں کے اثرات سے سقیم الحال ہو گئی ہو بعض دفعہ خود بخود ردِ عمل کرنے والی قوتوں کو پیدا کر لیا کرتی ہے۔ مثلاً قوم میں کوئی زبردست دل و دماغ کا انسان پیدا ہو جاتا ہے یا کوئی نئی تخیل نمودار ہوتی ہے یا کوئی ہمہ گیر مذہبی اصلاح کی تحریک بروئے کار آتی ہے۔ جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ قوم کے قوائے ذہنی و روحانی تمام باغی اور سرکش قوتوں کو اپنا مطیع و منقاد بنانے اور اس مواد فاسد کو خارج کر دینے سے جو قوم کے نظامِ جسمانی کی صحت کے لئے مضر تھا قوم کو نئے سرے سے زندہ کر دیتے ہیں اور اس کی اصلی توانائی اس کے اعضا میں عود کر آتی ہے۔ اگرچہ قوم کی ذہنی اور دماغی قابلیت کا دھارا افراد ہی کے دماغ میں سے ہو کر بہتا ہے لیکن پھر بھی قوم کا اجتماعی

نفس ناطقہ جو مدرک، کلیات اور جزئیات اور نعبیر و مرید ہے بجائے خود ضرور موجود ہوتا ہے۔" جمہوری رائے اور قومی سلطنت" وہ جملے ہیں جن کی وساطت سے ہم موہوم و مبہم طور پر اس نہایت ہی اہم حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ قومی ہستی ذوی العقل اور ذوالارادہ ہے۔ ازدحام خلائق، جلسۂ عام، جماعت انتظامی، فرقہ مذہبی اور مجلس مشاورت وہ مختلف ذرائع ہیں جن سے قوم اپنی تدوین و تنظیم کا کام لے کر وحدتِ ادراک کی غائت کو حاصل کرتی ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ قومی دماغ تمام ان مختلف خیالات کی خبر یا علم رکھتا ہو جو ایک وقت خاص میں افراد کے دماغوں میں مصروف ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ خود افراد کا دماغ بھی کامل طور پر اپنی ادراکی حالتوں سے آگاہ نہیں ہوتا۔ اجتماعی (یعنی قومی) دماغ میں بہت سے احساسات و مقامات و تخیلات قومی حاسہ کی دہلیز سے باہر رہتے ہیں۔ قوم کی ہمہ گیر دماغی زندگی کا فقط ایک جزو محدود دروازہ کے اندر قدم رکھتا ہے اور قومی ادراک کی تابناک شعاعوں سے منور ہوتا ہے۔ اس انتظام کی بدولت مرکزی اعضا کی توانائی کی ایک بہت بڑی مقدار غیر ضروری جزئیات پر صرف ہونے سے محفوظ رہتی ہے۔

جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ قوم ایک جداگانہ زندگی رکھتی ہے۔ یہ خیال کہ اس کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں کہ یہ اپنے موجودہ افراد کا محض ایک مجموعہ ہے اصولاً غلط ہے اور اسی لئے تمدنی و سیاسی اصلاح کی تمام وہ تجاویز جو اس مفروضہ پر مبنی ہوں بہت احتیاط کے ساتھ نظر ثانی کی محتاج ہیں۔ قوم اپنے موجودہ افراد کا مجموعہ ہی نہیں ہے بلکہ اس سے بہت کچھ بڑھ کر ہے اس کی ماہیت پر اگر نظر غائر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ غیر محدود اور لامتناہی

ہے۔ اس لیئے کہ اس کے اجزائے ترکیبی میں وہ کثیر التعداد آنے والی نسلیں بھی شامل
ہیں جو اگرچہ عمرانی حد نظر کے فوری منتہا کے پرلی طرف واقع ہیں لیکن ایک زندہ
جماعت کا سب سے زیادہ اہم جزو متصور ہونے کے قابل ہیں۔ علم الحیات کے
انکشافات جدیدہ نے اس حقیقت کے چہرہ پر سے پردہ اٹھایا ہے کہ کامیاب
حیوانی جماعتوں کا حال ہمیشہ استقبال کے تابع ہوتا ہے۔ مجموعی حیثیت سے
اگر نوع پر نظر ڈالی جائے تو اس کے وہ افراد جو ابھی پیدا نہیں ہوئے اس کے
موجودہ افراد کے مقابلہ میں شاید زیادہ بدیہی الوجود ہیں۔ موجودہ افراد کی فوری
اغراض ان غیر محدود و نامشہود افراد کی اغراض کے تابع بلکہ ان پر نثار کر دی جاتی ہیں
جو نسلاً بعد نسل بتدریج ظاہر ہوتے رہتے ہیں اور علم الحیات کی اس حیرت انگیز
حقیقت کو وہ شخص بہ نگاہِ استغنا نہیں دیکھ سکتا جس کے پیش نظر سیاسی یا تمدنی اصلاح
ہے۔ میں اپنی قوم کی موجودہ عمرانی حرکت پر اس پہلو سے نظر ڈالنا چاہتا ہوں اور اس
کی تنقید استقبالی طور پر کرنا چاہتا ہوں۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو اقوام کے
لئے سب سے زیادہ مہتم بالشان عقدہ فقط یہ عقدہ ہے (خواہ اس کی نوعیت
تمدنی قرار دی جائے خواہ اقتصادی خواہ سیاسی) کہ قومی ہستی کا سلسلہ بلا انقطاع
کس طرح قائم رکھا جائے۔ مٹنے یا معدوم ہو جانے کے خیال سے قومیں بھی ویسی
ہی خائف ہیں جیسے افراد۔ کسی قوم کی مختلف عقلی یا غیر عقلی قابلیتوں اور استعدادوں کے
محاسن کا اندازہ ہمیشہ اسی غایت الغایات سے کرنا چاہیئے۔ ہم کو لازم ہے کہ اپنے
محاسن کو جانچیں اور پرکھیں اور اگر ضرورت آپڑے تو نئے محاسن پیدا کریں۔ اس لیئے
کہ بقول نیٹشا کے کسی قوم کی بقا کا دارومدار محاسن کی مسلسل اور غیر منقطع تولید پر ہوتا

ہے۔ کائنات یقیناً جناب باری کی حکمت بالغہ کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہوتی ہے۔ مگر اس کا مفہوم سرتاسر انسانی ہے۔ لیکن اس تبصرہ کے آغاز سے پہلے میں چند تمہیدی امور پر بحث کرنا چاہتا ہوں۔ اس لئے کہ یہ بحث میرے نزدیک جماعتِ مسلمین کے متعلق کسی قطعی نتیجہ پر پہنچنے کے لئے ضروری ہے۔ یہ امور جن پر میں ترتیب وار نظر ڈالوں گا حسب ذیل ہیں:-

۱۔ جماعت المسلمین کی ہیئت ترکیبی۔

۲۔ اسلامی تمدن کی یک رنگی۔

۳۔ اس سیرت کا نمونہ جو مسلمانوں کی قومی ہستی کے تسلسل کے لئے لازمی ہے۔

اوّلاً مسلمانوں اور دنیا کی دوسری قوموں میں اصولی فرق یہ ہے کہ قومیت کا اسلامی تصوّر دوسری اقوام کے تصوّر سے بالکل مختلف ہے۔ ہماری قومیت کا اصل اصول نہ اشتراک زبان ہے نہ اشتراک وطن، نہ اشتراکِ اغراضِ اقتصادی، بلکہ ہم لوگ اس برادری میں جو جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمائی تھی۔ اس لئے شریک ہیں کہ مظاہرِ کائنات کے متعلق ہم سب کے معتقدات کا سرچشمہ ایک ہے۔ اور جو تاریخی روایات ہم سب کو ترکہ میں پہنچی ہیں وہ بھی ہم سب کے لئے یکساں ہیں۔ اسلام تمام مادّی قیود سے بیزاری ظاہر کرتا ہے اور اس کی قومیت کا دارومدار ایک خاص تہذیبی تصویر پر ہے جس کی تجسیمی شکل وہ جماعت اشخاص ہے جس میں بڑھتے اور پھیلتے رہنے کی قابلیت طبعاً موجود ہے۔ اسلام کی زندگی کا انحصار کسی خاص قوم کے خصائل مخصوصہ و شمائل مختصہ پر نہیں ہے۔ غرض اسلام زمان و مکان کی قیود سے مبّرا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ قوم عرب نے جس کے بطن سے اسلام

پیدا ہوا اس کی پولٹیکل نشو ونما میں بہت بڑا حصّہ ہے لیکن اسلامی علوم وفنون اور فلسفہ و حکمت کے انمول موتیوں کو رولنے کا کام اور یہ وہ کام ہے جو نفسِ ناطقہ انسانی کی اعلیٰ زندگی کے کارناموں سے متعلق ہے، زیادہ تر غیر عرب اقوام ہی نے انجام دیا معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اسلام کا ظہور قوم عرب کی زندگی کی تاریخ میں یزداں طلبی کی ایک آنی وعارضی جھلک ہونے کے لحاظ سے گویا برق کی چشمک تھی یا شرار کا تبسم تھا، لیکن اسلام کی دماغی توانائیوں کا جولانگاہ عرب نہ تھا بلکہ عجم تھا۔ پس چونکہ اسلام کا جوہرِ ذاتی بلا کسی آمیزش کے خالص طور پر ذہنی یا تخیلی ہے لہٰذا کیونکر ممکن تھا کہ وہ قومیت کو کسی خارجی یا حسّی اصول مثلاً وطن پر مبنی قرار دینا جائز تصوّر کرے۔ قومیت کا ملکی تصوّر جس پر زمانہ حال میں بہت کچھ حاشئے چڑھائے گئے ہیں اپنی آستین میں اپنی تباہی کے جراثیم کو خود پرورش کر رہا ہے اور اس میں شک نہیں کہ قومیت کے جدید تصوّر نے چھوٹے چھوٹے پولٹیکل حلقے قائم کرکے اور ان میں رقابت کے اس صحیح القوام عنصر کو پھیلا کر (جس تمدّن جدیدہ میں بوقلمونی کا پیوند لگا یا گیا ہے) دنیا کو تھوڑا بہت فائدہ ضرور پہنچایا ہے لیکن بڑی خرابی اس تصوّر میں یہ ہے کہ اس میں غلو اور افراط کا تناسخانہ نکل آتا ہے۔ اس نے بین الاقوامی نیتوں کی نسبت غلط فہمی پھیلا رکھی ہے۔ اس نے پولٹیکل سازشوں اور منصوبہ بازیوں کا بازار گرم کر رکھا ہے اس نے فنون لطیفہ وعلوم ادبیہ کو خاص خاص قوموں کی خصوصیات کی میراث قرار دے کر عام انسانی عنصر کو اس میں سے نکال دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وطن پرستی کا خیال جو قومیّت کے تصوّر سے پیدا ہوتا ہے ایک طرح سے مادّی شئے کا تالیہ ہے جو سراسر اصول اسلام کے خلاف ہے۔ اس لئے کہ اسلام دنیا میں ہر طرح کے

شرک خفی و جلی کا قلع قمع کرنے کے لیئے نمودار ہوا تھا لیکن اس سے یہ گمان نہ کیا جائے
کہ میں جذبہ حُبِ وطن کا سرے سے مخالف ہوں ۔ ان قوموں کے لیئے جن کا اتحاد حدودِ
ارضی پر مبنی ہو اس جذبہ سے متاثر ہونا ہر طرح سے حق بجانب ہے لیکن میں اُن لوگوں کے
طرزِ عمل کا یقیناً مخالف ہوں جو اس امر کے معترف ہونے کے باوجود کہ جذبہ حُبِ وطن
قومی سیرت کا ایک قیمتی عنصر ہے ۔ ہم مسلمانوں کی عصبیت کو نام دھرتے ہیں اور اسے
وحشیانہ تعصّب کہہ کر پکارتے ہیں ۔ حالانکہ ہماری عصبیت ایسی ہی حق بجانب ہے جیسی
ان کی وطن پرستی ۔ عصبیت سے بجز اس کے اور کچھ مراد نہیں کہ اصول حبِ نفس بجائے
اس کے کہ ایک فردِ واحد میں ساری و دائرہ ہو ایک جماعت پر اپنا عمل کرتا ہے ۔ حیوانات
کی تمام نوعیں کم و بیش ضرور ہوتی ہیں اور اگر انہیں اپنی انفرادی یا اجتماعی ہستی برقرار رکھنی
ہو تو ضرور ہے کہ ان میں عصبیت موجود ہو ۔ اقوامِ عالم پر نظر ڈالیے ، ایک قوم بھی ایسی
نہ ہوگی ، جو پیرایۂ عصبیت سے عاری ہو ۔ کسی فرانسیسی کے مذہب پر نکتہ چینی کیجیئے وہ
بہت ہی کم متاثر ہوگا ، اس لیئے کہ آپ کی نکتہ چینی نے اس اصول کو مس نہیں کیا ، جو اس
کی قومیت کی روحِ رواں ہے لیکن ذرا اس کے تمدّن ، اس کے ملک یا پولیٹیکل سرگرمیوں کے
کسی شعبہ کے متعلق اس کی قوم کے مجموعی طرزِ عمل یا شعار پر نکتہ گیری کر دیکھیئے ۔ پھر
اس کی جبلّی عصبیت کا شعلہ بھڑک نہ اٹھے تو ہم جانیں ۔ بات یہ ہے کہ فرانسیسی کی قومیت
کا انحصار اس کے معتقدات مذہبی پر نہیں ہے بلکہ جغرافیائی حدود یعنی اس کے ملک
پر ہے ۔ پس جب آپ اس خاص خطۂ زمین پر جسے اُس نے اپنے تخیل میں اپنی قومیت
کا اصلی اصول قرار دے رکھا ہے معترض ہوتے ہیں ، تو آپ اس کی عصبیت کو داجبی
طور پر انگیختہ کرتے ہیں لیکن ہماری حالت اس سے بالکل مختلف ہے ۔ ہماری قومیت

ایک شے موجود فی الذہن ہے موجود فی الخارج نہیں ہے بلحاظ ایک قوم ہونے کے ہم جس مرکز پر آ کر جمع ہو سکتے ہیں وہ مظاہر آفرینش کے متعلق ایک خاص قسم کا اشتراکی سمجھوتہ ہے جو ہم نے آپس میں کر رکھا ہے۔ پس اگر کسی کا ہمارے مذہب کو برا کہنا ہماری آتش عصبیت کو برافروختہ کرتا ہے۔ میری دانست میں یہ برافروختگی اس فرانسیسی کے غصہ سے کچھ کم واجبی نہیں ہے جو اپنے وطن کی برائیاں سن کر بھڑک اٹھتا ہے۔ عصبیت سے صرف قومی پاسداری مراد ہے۔ دوسری اقوام کو بہ نگاہِ تنفر دیکھنا اس کے مفہوم میں داخل نہیں ہے۔ بزمانہ قیام انگلستان جب کبھی مجھے کسی خاص مشرقی رسم یا طرزِ خیال کو کسی انگلش لیڈی یا جنٹلمین کے سامنے بیان کرنے کا اتفاق ہوا تو مجھے یاد نہیں پڑتا کہ اس پر اظہار تعجب نہ کیا گیا ہو جس سے مجھے رہ رہ کر یہ خیال پیدا ہوتا تھا کہ ان لوگوں کے نزدیک ہر غیر انگلش خیال گویا داخل عجائبات قدرت ہے۔ مجھے انگریزی قوم کا یہ وطیرہ نہایت ہی پسند ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ قوم پیرایہ تخیل سے عاری ہے۔ جس خاک سے شکسپیئر، شیلے، کیٹس، ٹینی سن اور سوئنبرن پیدا ہوئے ہوں۔ وہ بھلا خیال آفرینیوں اور نزاکت آرائیوں سے کیوں کر معرا ہو سکتی ہے۔ البتہ یہ بات ہمیں ماننی پڑتی ہے کہ انگلستان کا طریقہ ماند و بود اور طرزِ غور و فکر، وہاں کے آئین و قوانین اور اس کے رسم و رواج اس ملک کے رہنے والوں کی زندگی کے اجزائے لاینفک بن گئے ہیں۔

غرض مذہبی خیال بلا اس دینی اکتناز کے جو افراد کی آزادی میں غیر ضروری طور پر مخلل انداز ہو اسلامی جماعت کی ہئیت ترکیبی کا مدار علیہ ہے۔ اگسٹس کانٹ کا قول ہے کہ:

"چونکہ مذہب ہماری کل ہستی پر حاوی ہے لہٰذا اس کی تاریخ ہماری نشوونما کی پوری تاریخ کا خلاصہ ہونا چاہیئے۔"

یہ قول جیسا ہماری قوم پر صادق آتا ہے ویسا کسی اور قوم پر نہیں۔ لیکن یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اگر اسلامی جماعت کی ہیئت ترکیبی کا انتہائی مدار علیہ محض وہ چند معتقدات ہیں جن کی نوعیت مابعد الطبیعی ہے تو کیا یہ بنیاد نہایت ہی متزلزل نہیں ہے خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ علوم جدیدہ تیز پا ترقی کر رہے ہیں اور ہر بات کے حسن و قبح کو پرکھنا اور معقولات اور منطقی استدلال سے قدم قدم پر کام لینا ان علوم کا لازمہ قرار دیا گیا ہے۔ مشہور فرانسیسی مستشرق رینان کا بھی خیال تھا اور ان ہی الفاظ میں اس نے یہ امید ظاہر کی تھی کہ اسلام ایک دن دنیا کے ایک بڑے حصے کی عقلی و اخلاقی پیشوائی کے منصب اعلیٰ سے گر جائے گا۔ جن اقوام کی اجتماعی زندگی کا اصل اصول حدود ارضی سے وابستہ ہو انہیں معقولات سے خائف نہ ہونا چاہیئے۔ لیکن ہمارے حق میں یہ ایک خطرناک دشمن ہے۔ اس لئے کہ یہ ان اصول کو مٹانا چاہتا ہے جس پر ہماری قومی ہستی مبنی ہے اور جس نے ہمارے اجتماعی وجود کو قابل فہم بنا رکھا ہے۔ تعقل دراصل تجزیہ ہے اور اس لئے معقولات سے اس قومی شیرازہ کے بکھر جانے کا اندیشہ ہے جو مذہبی قوت کا باندھا ہوا ہے۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ ہم معقولات کا توڑ عقلی دلیلوں سے کر سکتے ہیں لیکن میں جس بات پر زور دینا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اعتقاد یعنی ہمہ گیر دفاق کا وہ نکتہ جس پر ہماری جماعت کی وحدت منحصر ہے ہمارے لئے اپنے مفہوم کے لحاظ سے عقلی نہیں بلکہ قومی ہے۔ مذہب کو فلسفہ نظری بنانے کے لئے کوشش کرنا میری رائے میں بے سود محض بلکہ لغو و مہمل ہے۔ اس لئے کہ مذہب

کا مقصد یہ نہیں کہ انسان بیٹھا ہوا زندگی کی حقیقت پر غور کیا کرے، بلکہ اس کی اصلی غایت یہ ہے کہ زندگی کی سطح کو بتدریج بلند کرنے کے لئے ایک مربوط اور متناسب عمرانی نظام قائم کیا جائے۔ مذہب سیرت انسانی کا ایک نیا اسلوب یا نمونہ پیدا کر کے اس شخص کے اثر کے لحاظ سے جو اس سیرت کا مظہر ہے، اس نمونے کو دنیا میں پھیلانا چاہتا ہے اور اس طور پر چونکہ وہ ایک نئی دنیا کو نیست سے ہست کرتا ہے لہٰذا اس پر مابعد الطبیعات کا اطلاق ہوتا ہے۔ میری مراد ان تمام باتوں سے جو اوپر بیان کی گئی ہیں یہ ہے کہ اسلام کی حقیقت ہمارے لئے یہی نہیں کہ وہ ایک مذہب ہے بلکہ اس سے بہت بڑھ کر ہے۔ اسلام میں قومیت کا مفہوم خصوصیات کے ساتھ چھپا ہوا ہے اور ہماری قومی زندگی کا تصور اس وقت تک ہمارے ذہن میں نہیں آ سکتا جب تک کہ ہم اصول اسلام سے پوری طرح باخبر نہ ہوں بالفاظ دیگر اسلامی تصور ہمارا وہ ابدی گھر یا وطن ہے جس میں ہم اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ جو نسبت انگلستان کو انگریزوں اور جرمنی کو جرمنوں سے ہے، وہ اسلام کو ہم مسلمانوں سے ہے۔ جہاں اسلامی اصول یا ہماری مقدس روایات کی اصطلاح میں خدا کی رسی ہمارے ہاتھ سے چھوٹی اور ہماری جماعت کا شیرازہ بکھرا۔

ثانیاً

معتقدات مذہبی کی وحدت جس پر ہماری قومی زندگی کا دارومدار ہے، اگر مضاف سے تعبیر کی جائے تو اسلامی تہذیب کی یک رنگی بمنزلہ اس کے مضاف الیہ کے ہے۔ محض اسلام پر ایمان لے آنا اگرچہ نہایت ہی ضروری ہے لیکن کافی و مکتفی نہیں ہے۔ قومی ہستی میں شریک ہونے کی غرض سے ہر فرد کے لئے قلب ماہیت لازمی

ہے اور اس قلب ماہیت کے لئے خارجی طور پر تو ارکان و قوانین اسلام کی پابندی کرنی چاہیئے اور اندرونی طور پر اس یک رنگ تہذیب و شائستگی سے استفادہ کرنا چاہیئے، جو ہمارے آباؤ اجداد کی متفقہ عقلی تحریک کا ماحصل ہے۔ اسلامی جماعت کی تاریخ پر جس قدر زیادہ غور کیا جائے گا، اسی قدر یہ تاریخ حیرت انگیز اور تعجب خیز نظر آئے گی۔ اس دن سے جب کہ اسلام کا سنگ بنیاد رکھا گیا سولہویں صدی کے آغاز تک یعنی تقریباً ایک ہزار سال کا زمانہ اس بے چین قوم نے ملک گیریوں اور جہاں کشائیوں میں صرف کیا۔ اگرچہ اس ہمہ گیر مشغلہ میں منہمک ہونے کے باعث انہیں کسی دوسرے شغل کی فرصت نہ ہو سکتی تھی لیکن پھر بھی اسلامی دنیا نے علم و حکمت کے قدیم خزانوں کو ڈھونڈھ نکالا اور ان پر اپنی طرف سے معتدبہ اضافہ کر کے ایک عدیم النظیر لٹریچر کا سرمایہ دنیا کے سامنے پیش کیا اور اس کے علاوہ ایک ایسے جامع و مانع نظام فقہ کو مدون کیا جو اسلامی تمدن کا غالباً سب سے گراں مایہ ترکہ ہے جس طرح جماعت مسلمین ان اختلافات کو جن کی بنا رنگ و خون پر ہو تسلیم نہیں کرتی اور دنیا کی تمام نسلوں کو انسانیت کے ہمہ گیر خیال کے مسلک میں منسلک کرنا اپنی غایت سمجھے ہوئے ہے، اسی طرح مسلمانوں کی تہذیب و شائستگی کا معیار بھی عالمگیر ہے اور اس کا وجود و نشو و نما کسی ایک قوم خاص کی دماغی قابلیتوں کا مرہون منت نہیں ہے، البتہ ایران اس تہذیب و شائستگی کی نشو و نما کا جزو اعظم قرار پا سکتا ہے اگر مجھ سے سوال کیا جائے کہ تاریخ اسلام کا سب سے اہم واقعہ کون سا ہے تو میں بلا تامل اس کا یہ جواب دوں گا کہ فتح ایران۔ معرکہ نہاوند نے عربوں کو نہ صرف ایک دلفریب زمین کا مالک بنا دیا بلکہ ایک قدیم قوم پر مسلط کر دیا جو سامی اور آریہ

مسالے سے ایک نئے تمدن کا محل تعمیر کرنے کی قابلیت رکھتی تھی۔ ہمارا اسلامی تمدن سامی تفکر اور آریہ تخیل کے اختلاط کا ماحصل ہے۔ جب ہم اس کے خصائل و شمائل پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس کی نزاکت اور دلربائی اُسے اپنی آریہ ماں کے بطن سے اور اس کا وقار و متانت اُسے اپنے سامی باپ کے سلب سے ترکہ میں ملا ہے۔ فتح ایران کی بدولت مسلمانوں کو وہی گرانمایہ متاع ہاتھ آئی، جو تسخیر یونان کے باعث اہل روما کے حصہ میں آئی تھی۔ اگر ایران نہ ہوتا تو ہمارے تمدن کی تصویر بالکل یک رُخی ہوتی۔

یہاں ضمناً اس امر کا ذکر کرنا بے جا نہ ہوگا کہ وہ قوم جس کے اختلاط نے عربوں اور مغلوں کی شکل ہی بدل دی عقلی و ادراکی لحاظ سے مردہ نہیں ہے۔ ایران جس کی پولیٹیکل آزادی کو روس کی غاصبانہ آرزوؤں نے معرض خطر میں ڈال رکھا ہے ابھی تک اسلامی تہذیب کا ایک بڑا مرکز ہے اور ہم لوگوں کی دلی تمنا ہے کہ اسلامی دنیا میں اس کا وہ درجہ جواب تک قائم رہتا چلا آیا ہے بدستور قائم رہے۔ ایران کے شاہی خاندان کے لئے ایران کی پولیٹیکل آزادی کا فقدان فقط اس کا ہم معنی ہوگا کہ زمین کا ایک ٹکڑا اس کے قبضہ سے نکل گیا لیکن اسلامی تہذیب کے لئے یہ واقعہ تیرھویں صدی کے تاتاری حملہ سے بھی زیادہ بلاخیز و مصیبت انگیز ہوگا۔ بہرحال یہ ایک پولیٹیکل بحث ہے جس میں میں اس وقت نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ میں صرف یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ جماعتِ مسلمین کا زندہ رُکن بننے کے لئے انسان کو مذہب اسلام پر بلا شرط ایمان لانے کے علاوہ اسلامی تہذیب کے رنگ میں اپنے تئیں پوری طرح سے رنگنا چاہیئے۔ "صبغۃ اللہ" کے اس خم میں غوطہ لگانے کا مدعا یہ ہے کہ مسلمان

دورنگی چھوڑ کر یک رنگ ہو جائیں۔ ان کا ذہنی منظر ایک ہو۔ وہ مظاہرِ آفرینش پر ایک خاص پہلو سے نظر ڈالیں۔ اشیا کی ماہیت اور قدر و قیمت کو اس اندازِ خاص کے ساتھ جانچیں جو جماعت اسلامی اور دوسری جماعتوں کا مابہ الامتیاز ہے اور جو مسلمانوں کو ایک غائیت مختصہ و مقصدِ معینہ کے پیرائے سے آراستہ کر کے انہیں "کل مومن اخوۃ" کی کتاب کے اوراق بنا دیتا ہے۔

ثالثاً

شِق ثانی کے تحت میں ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے اُس سے واضح ہو گیا ہو گا کہ اسلامی سیرت کے نمونے کی نمایاں خصوصیات کیا کیا ہونی چاہئیں۔ لیکن یہ جتا دینا ضروری ہے کہ سیرت کے وہ مختلف نمونے جنہیں ایک قوم پسندیدگی کی نظر سے دیکھتی ہے بخت و اتفاق کی کورانہ قوتوں کا ماحصل نہیں ہیں۔ زمانہ حال کا علمِ عمرانیات ہمیں یہ نکتہ سکھاتا ہے کہ قوموں کا اخلاقی تجربہ خاص خاص قوانین معینہ کا تابع ہوا کرتا ہے۔ زمانہ قبل تاریخ میں جب کہ زندہ رہنے کے لیے انسان کو سخت جد و جہد کرنی پڑتی تھی اور دماغی قابلیتوں کے مقابلہ میں وہ جسمانی قوتوں سے زیادہ کام لیتا تھا تو اس شخص کی سب تعریف و تقلید کرتے تھے، جو شجاع ہوتا تھا۔ جب جہد للبقاء کی کشمکش فرو ہوئی اور خطرہ زائل ہو گیا تو دورِ شجاعت گیا اور باصطلاح گڈنگس دورِ مروت آیا جس میں جرأت و دلاوری اگرچہ پھر بھی مستحسن سمجھی جاتی تھی لیکن انسانی سیرت کا ہر دلعزیز اور عام پسند نمونہ وہ شخص متصور ہوتا تھا جو نشاطِ عمر کی ہر صنعت کا رسیا ہو اور فیاضی و ایثار اور ہم نوائی و ہم پیالگی کے گوناگوں اوصاف سے متصف ہو لیکن چونکہ ان دونوں اسباب کا میلان غلو و افراط کی جانب تھا لہٰذا ان کے عمل کا رد ایک

تیسرے نمونہ یا اسلوب نے کیا جس کی غایت الغایت ضبط نفس ہے اور جو زندگی پر زیادہ متانت و تفننفت کے ساتھ نظر ڈالتا ہے۔ ہندوستان میں جب ہم اسلامی جماعت کے ارتقاء کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں تیمور اسلوب اوّل کا مظہر نظر آتا ہے۔ بابر اسالیب اول و دوم کے امتزاج کو ظاہر کرتا ہے۔ جہانگیر اسلوب ثانی کے سانچے میں خصوصیت کے ساتھ ڈھلا ہوا ہے اور عالمگیر جس کی زندگی اور کارنامے میری دانست میں ہندوستان کی اسلامی قومیت کی نشو و نما کا نقطہ آغاز ہیں اسلوب ثالث کا چہرہ کشا ہے۔ ان لوگوں کے نزدیک جنہوں نے عالمگیر کے حالات تاریخ ہند کے مغربی شارحین کی زبانی سُنے ہیں عالمگیر کا نام سفاکی و قساوت، جبر و استبداد، مکاری اور غداری اور پولیٹیکل سازشوں اور منصوبوں کے ساتھ وابستہ ہے خلافِ مبحث کا خوف مانع ہے ورنہ میں متعاصرانہ تاریخ کے واقعات کی صحیح تعبیر و تفسیر سے ثابت کرتا کہ عالمگیر کی پولیٹیکل زندگی کی وجوہ تحریک سراسر جائز و حق بجانب تھیں۔ اس کے حالات زندگی اور اس کے عہد کے واقعات کا بنظر انتقاد مطالعہ کرنے کے بعد مجھے یقین واثق ہوگیا ہے کہ جو الزامات اس پر لگائے جاتے ہیں وہ واقعاتِ متعاصرہ کی غلط تعبیر اور ان تمدنی و سیاسی قوتوں کی غلط فہمی پر مبنی ہیں جو ان دنوں سلطنتِ اسلام کے طول و عرض میں عمل کر رہی تھیں۔ میری رائے میں قومی سیرت کا وہ اسلوب جس کا سایہ عالمگیر کی ذات نے ڈالا ہے ٹھیٹھ اسلامی سیرت کا نمونہ ہے اور ہماری تعلیم کا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ اس نمونے کو ترقی دی جائے اور مسلمان ہر وقت اسے پیش نظر رکھیں۔

اگر ہمارا مقصد یہ ہو کہ ہماری قومی ہستی کا سلسلہ ٹوٹنے میں نہ آئے تو ہمیں

ایک ایسا اسلوب سیرت تیار کرنا چاہیئے جو اپنی خصوصیاتِ مختصہ سے کسی صورت میں بھی علیحدگی نہ اختیار کرے اور خذ ما صفا ودع ما کدر کے زریں اصول کو پیش نظر رکھ کر دوسرے اسالیب کی خوبیوں کو اخذ کرتے ہوئے ان تمام عناصر کی آمیزش سے اپنے وجود کو کمال احتیاط کے ساتھ پاک کر دے جو اس کی روایات مسلمہ و قوانینِ منضبطہ کے منافی ہوں۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی عمرانی رفتار کو بہ نگاہِ غور دیکھنے سے اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے جو قوم کے اخلاقی تجربہ کے مختلف خطوط کا نقطۂ اتصال ہے۔

ممالک متحدہ آگرہ و اودھ میں بوجہ اس خفیف سے اختلاف کے جو وہاں کے عقلی حوالی میں ساری و دائر ہے، اس اسلوب سیرت کی ضرورت کا اعلان ایک شاعر کے زبردست تخیل نے بلند آہنگی کے ساتھ کیا ہے۔ جناب مولانا سے اکبر الہ آبادی جنہیں موزوں طور پر لسان العصر کا خطاب دیا گیا ہے اپنے بذلہ سنجانے پیرائے میں ان قوتوں کی ماہیت کے احساس کو چھپائے ہوئے ہیں جو آج کل مسلمانوں پر اپنا عمل کر رہی ہیں۔ ان کے کلام کے ظریفانہ لب و لہجہ پر نہ جائیے۔ ان کے شاب آور قہقہے ان کے آنسوؤں کے پردہ دار ہیں۔ وہ اپنے نہاں خانہ صنعت میں اس وقت تک آپ کو داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتے جب تک کہ آپ اُن کا مال خریدنے کے لئے ذوقِ سلیم کے دام اپنی جیب میں ڈال کر نہ آئیں۔ غرض اس جماعت میں جس کے اجزائے ترکیبی کی نوعیت واحد ہو، خیالات و جذبات کا تعلق یہاں تک گہرا ہوتا ہے کہ اگر اس جماعت کے ایک حصے کے دل میں کوئی خواہش پیدا ہوتی ہے تو اس خواہش کے برلانے کا سامان یک بیک دوسرا حصہ پیدا کر دیتا ہے۔

اب میں ایک قدم اور آگے بڑھتا ہوں۔ اس وقت تک جو بحث میں نے کی ہے اس میں، ذیل کی تین حقیقتوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

۱۔ مذہبی خیال اسلامی جماعت کا سرچشمۂ زندگانی ہے۔ اس جماعت کی صحت و توانائی کے قائم رکھنے کے لئے ان مخالف قوتوں کی نشو و نما کو جو اس کے اندر کام کر رہی ہیں بغور دیکھتے رہنا چاہئے اور خارجی عناصر کی صریح آمیزش سے اول تو بچانا اور یا اگر آمیزش منظور ہی ہو تو اس امر کو پیش نظر رکھنا چاہئے کہ یہ آمیزش آہستہ آہستہ اور بتدریج ہو تاکہ نظام مدنی کی قوت اخذ و جاذبہ پر زیادہ زور نہ پڑے اور اس طور پر یہ نظام بالکل ہی درہم برہم نہ ہو جائے۔

۲۔ جماعت اسلامی سے جس فرد کو تعلق ہو اس کا ذہنی سرمایہ اس دولت سے ماخوذ ہونا چاہئے جو اس کے آباؤ اجداد کی دماغی قابلیتوں کا ماحصل ہے، تاکہ وہ ماضی و استقبال کے ساتھ حال کے ربط و تسلسل کو محسوس کرتا رہے۔

۳۔ اس کے خصائل و شمائل اس خاص اسلوب سیرت کے مطابق ہوں جس کو میں نے اسلامی اسلوب سے تعبیر کیا ہے۔ اب میں تمدن کے مختلف شعبوں میں مسلمانوں کے قومی کارناموں کی قدر و قیمت کا جائزہ لیتا ہوں۔ اسلامی دنیا نے جہاں بانی، مذہب، ادب، حکمت، درس و تدریس، وقائع نگاری، صنعت و حرفت اور تجارت کی اصناف میں جو جو کام کیا ہے اس کی مبسوط تنقید کئی ضخیم جلدوں کی محتاج ہو گی۔ عالم اسلام میں جو واقعات اس وقت پیش آ رہے ہیں وہ نہایت ہی معنی خیز ہیں اور ان پر تفحص کی نگاہ ڈالنا بہت کچھ سبق آموز ثابت ہو سکتا ہے لیکن یہ کام بے حد محنت طلب ہے اور میں اس کی انجام دہی سے قاصر ہوں۔ اس لئے میرا تبصرہ فقط مسلمانان ہند

کے کارناموں سے متعلق ہوگا۔ اگرچہ اس موضوع پر بھی ان مختلف مسائل کی نسبت جو ہمیں درپیش ہیں میں شرح و بسط کے ساتھ رائے زنی نہ کر سکوں گا۔ میں صرف دو امور سے بحث کروں گا۔

۱۔ تعلیم اور

۲۔ عامہ خلائق کی عام حالت کی اصطلاح۔

گزشتہ پچاس سال کے دوران میں مسئلہ تعلیم ہماری ہمتوں اور سرگرمیوں کا نصب العین بنا رہا ہے۔ یہ سوال کرنا بے جا نہ ہوگا کہ آیا اشاعت تعلیم میں ہم نے کسی خاص رعایت کو پیش نظر رکھا ہے یا استقبال کی طرف سے مطلقاً خالی الذہن ہو کر محض حال کی فوری اغراض کا لحاظ کیا ہے؟ ہم نے کس قسم کے تعلیم یافتہ اشخاص تیار کیے ہیں؟ آیا ان اشخاص کی قابلیت ایسی ہے کہ ہم مسلمانوں کی سی مختلف الترکیب جماعت کی عمرانی ہستی کے تسلسل کی کفیل ہو سکے؟ ان سوالات کے جوابات کنایتہً پہلے ہی دیئے جا چکے ہیں۔ علم النفس کے اصول سے جو لوگ واقف ہیں انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ نفس ناطقہ کی وہ کیفیت جسے استبصار یا ہشیاری سے تعبیر کرتے ہیں۔ ذہنی حالتوں کے باقاعدہ تواتر پر منحصر ہوتی ہے۔ جب نفس ناطقہ کے سلسلہ ہوشیاری میں خلل واقع ہو جاتا ہے تو نفس بیمار پڑ جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قوائے حیوانی رفتہ رفتہ تحلیل ہو جاتے ہیں۔ یہی حالت اقوام کے نفسِ ناطقہ کی ہے جس کا تسلسل اس اجتماعی تجربہ کے باقاعدہ انتقال پر ہے جو نسلاً بعد نسلاً قوم کو اپنے اسلاف سے میراث میں پہنچتا رہتا ہے۔ تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ اس توارث متوالیہ کی مؤید ہو کر نفس ناطقہ قومی کو استبصار کامل بنائے تاکہ وہ اپنی ذات کے ادراک پر

قادر ہو سکے۔ فرد کا رابطہ اتحاد اس قوم کے ساتھ جس کا وہ جزو ہے، اگر بڑھ سکتا ہے تو اس دانستہ کوشش سے تعلیم کے ذریعہ سے وہ روایات مجتمع کے جو مختلف اجزا اس طور پر منتقل کئے جاتے ہیں، وہ نفس ناطقہ قومی میں جذب اور پیوستہ ہو کر ان چند افراد قوم کے لئے میل و فرسنگ کا کام دیتے ہیں جن کی پوری زندگی اور کل قابلیت غور و فکر قوم کے مختلف غایات و مقاصد کی منزلیں طے کرنے میں گزر جاتی ہے۔ مثلاً ایک قوم کی قانونی، تاریخی اور علمی روایات اس قوم کے مقننوں، مؤرخوں اور انشا پردازوں کی چشم بصیرت کے سامنے ہر وقت ایک نمایاں شکل میں موجود رہتی ہیں۔ اگرچہ قوم کو مجموعی حیثیت سے ان روایات کا ادراک موہوم و مبہم طور پر ہوتا ہے۔ اس نقطہ خیال سے اگر ہم اپنے تعلیمی کارناموں کی قدر و قیمت کا اندازہ لگائیں تو معلوم ہوگا کہ موجودہ نسل کا نوجوان مسلمان قومی سیرت کے اسالیب کے لحاظ سے ایک بالکل نئے اسلوب کا ماحصل ہے جس کی عقلی زندگی کی تصویر کا پردہ اسلامی تہذیب کا پردہ نہیں ہے، حالانکہ اسلامی تہذیب کے بغیر میری رائے میں وہ صرف نیم مسلمان بلکہ اس سے بھی کچھ کم ہے اور وہ بھی اس صورت میں کہ اس کی خالص دنیوی تعلیم نے اس کے مذہبی عقائد کو متزلزل نہ کیا ہو۔ اس کا دماغ مغربی خیالات کی جولانگاہ بنا ہوا ہے اور میں علی رؤس الاشہاد کہتا ہوں کہ اپنی قومی روایات کے پیرایہ سے عاری ہو کر اور مغربی لٹریچر کے نشہ میں ہر وقت سرشار رہ کر اس نے اپنی قومی زندگی کے ستونوں کو اسلامی مرکز ثقل سے بہت پرے ہٹا دیا ہے۔ بلاخوف تردید میرا یہ دعویٰ ہے کہ دنیا کی کسی قوم نے ایسی اعلیٰ اور قابل تقلید مثالیں اپنے افراد میں پیدا نہیں کیں جیسی ہماری قوم نے لیکن بایں ہمہ ہمارے نوجوان کو جو

اپنی قوم کی سوانح عمری سے بالکل نابلد ہے مغربی تہذیب کے مشاہیر سے استحساناً
اور استشہاداً رجوع کرنا پڑتا ہے۔ عقلی واورا کی لحاظ سے وہ مغربی دنیا کا غلام ہے
اور یہی وجہ ہے کہ اُس کی رُوح اس صحیح القوام خودداری کے عنصر سے خالی ہے۔
جو اپنی قومی تاریخ اور قومی لٹریچر کے مطالعہ سے پیدا ہوتی ہے۔ ہم نے اپنی تعلیمی
جد و جہد میں اس حقیقت پر جس کا اعتراف تجربہ آج ہم سے کرا رہا ہے نظر نہیں
ڈالی کہ اغیار کے تمدن کو بلا مشارکت احدے اپنا ہر وقت کا رفیق بنائے رکھنا
گویا اپنے تیئں اس تمدن کا حلقہ بگوش بنا لینا ہے۔ یہ وہ حلقہ بگوشی ہے جس کے
نتائج کسی دوسرے مذہب کے دائرہ میں داخل ہونے سے بڑھ کر خطرناک ہیں۔
کسی اسلامی مصنف نے اس حقیقت کو مولانا ئے اکبر الہ آبادی سے زیادہ واضح
طور پر نہیں بیان کیا۔ جو نئی نسل کے مسلمانوں کی موجودہ عقلی زندگی پر ایک نظر غائر ڈالنے
کے بعد حسرت آفریں لہجہ میں پکار اٹھتے ہیں ؎

شیخ مرحوم کا یہ قول مجھے یاد آتا ہے
دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے

شیخ مرحوم کنایہ ہے حقیقتاً اسلامی تہذیب کے اُس قدامت انتساب نام
لیوا سے جو مغربی تعلیم کے بارے میں سرسید احمد خاں مرحوم کے ساتھ مدت العمر
بڑا جھگڑا کیا۔ آج ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ بے چارے شیخ کا خوف بے بنیاد نہ تھا
کیا اب بھی کسی کو اس میں کلام ہے کہ شیخ مرحوم کے قول میں جو سچائی کا شائبہ مضمر
ہے اس پر ہماری تعلیم کا ماحصل زندہ گواہ ہے۔ مجھے امید ہے کہ ان کی کڑوی کسیلی
باتوں کو سننے والے مجھے معاف فرمائیں گے۔ آج کل کی طالب العلمانہ زندگی سے

چونکہ گزشتہ دس بارہ سال کی مدت میں مجھے سابقہ پڑتا رہا ہے اور میں ایک ایسے مضمون کا درس دیتا رہا ہوں جس کو مذہب سے قریب کا تعلق ہے۔ لہذا میں اس بات کا تھوڑا بہت استحقاق رکھتا ہوں کہ میری باتیں سُنی جائیں۔ مجھے رہ رہ کر یہ رنج دہ تجربہ ہوا ہے کہ مسلمان طالب علم اپنی قوم کے عمرانی، اخلاقی اور سیاسی تصورات سے نا بلد ہے۔ روحانی طور پہ بمنزلہ ایک بے جان لاش کے ہے اور اگر موجودہ صورتِ حالات اور بیس سال قائم رہی تو وہ اسلامی رُوح جو قدیم اسلامی تہذیب کے چند علمبرداروں کے فرسودہ قالب میں ابھی تک زندہ ہے ہماری جماعت کے جسم سے بالکل ہی نکل جائے گی اور وہ لوگ جنہوں نے تعلیم کا یہ اصل الاصول قائم کیا تھا کہ ہر مسلمان بچّہ کی تعلیم کا آغاز قرآن مجید کی تعلیم سے ہونا چاہیئے وہ ہمارے مقابلہ میں ہماری قوم کی ماہیت و نوعیت سے زیادہ باخبر تھے۔

ہماری قومی سرگرمیوں کی متحرک اقتصادی اغراض ہی نہیں ہونی چاہئیں، قوم کی وحدت کی بقاء اور اُس کی زندگی کا تسلسل قومی آرزوؤں کا ایک ایسا نصب العین ہے جو فوری اغراض کی تکمیل کے مقابلہ میں بہت زیادہ اشرف و اعلیٰ ہے۔ ایک قلیل البضاعت مسلمان جو سینہ میں ایک دردو بھرا اسلامی دل رکھتا ہو۔ میری رائے میں قوم کے لئے بمقابلہ اس بیش قرار تنخواہ پانے والے آزاد خیال گریجویٹ کے زیادہ سرمایہ نازش ہے جس کی نظروں میں اسلام اصول زندگی نہیں ہے بلکہ محض ایک آلہ جلب منفعت ہے جس کے ذریعہ سے بڑے بڑے سرکاری عہدے زیادہ تعداد میں حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ میری ان باتوں سے یہ خیال نہ کیا جائے کہ میں مغربی تہذیب کا مخالف ہوں۔ اسلامی تاریخ کے ہر مبصر کو لامحالہ اس امر کا اعتراف

کرنا پڑے گا کہ ہمارے عقلی اور ادراکی گہوارے کو جھلانے کی خدمت مغرب ہی نے
انجام دی ہے۔ فلسفیانہ تخیل کی سرزمین میں ہم شاید ابھی تک بجائے عربی اور ایرانی
ہونے کے زیادہ تر یونانی نظر آرہے ہیں۔ بایں ہمہ اس سے کسی کو انکار نہ ہوگا کہ خود
ہماری خالص اسلامی تہذیب اپنی مثال آپ ہے اور تعلیم کا کوئی جدید اسلامی نظام
متعلمین کی قومیت پر حرف لائے بغیر اس کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اسلامی یونیورسٹی
کے خیال کا ہمارے دل میں پیدا ہونا حقیقت میں ہماری قومی ہستی کے حق میں ایک
مبارک علامت ہے۔ جب ہم اپنی قوم کی نوعیت پر نظر ڈالتے ہیں تو اس قسم
کے دارالعلم کی ضرورت میں شک اور شبہ کی مطلق گنجائش نہیں رہتی بشرطیکہ یہ
دارالعلم ٹھیٹھ اسلامی اصول پر چلایا جائے۔ کوئی قوم اس رشتہ کو یک بیک نہیں توڑ
سکتی جو اسے اس کے ایام گزشتہ سے جوڑے ہوئے ہے اور مسلمانوں کے
لئے تو اس تعلق کو چھوڑ دینا اور بھی محال ہے جن کی مجموعی روایات ان کی قومیت
کی جان ہیں۔ مسلمانوں کو بے شک علوم جدیدہ کی تیز رفتار کے قدم بہ قدم چلنا
چاہئے۔ لیکن یہ بھی ضرور ہے کہ اس کی تہذیب کا رنگ خالص اسلامی ہو اور یہ اس
وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ ایک ایسی یونیورسٹی موجود نہ ہو جسے ہم اپنی
قومی تعلیم کا مرکز قرار دے سکیں۔ ہم کو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اگر ہماری قوم کے
نوجوانوں کی تعلیمی اٹھان اسلامی نہیں ہے تو ہم اپنی قومیت کے پودے کو
اسلام کے آب حیات سے نہیں سینچ رہے ہیں اور اپنی جماعت میں پکے مسلمان
کا اضافہ نہیں کر رہے ہیں، بلکہ ایسا نیا گروہ پیدا کر رہے ہیں جو بوجہ کسی اکتسابی
یا اتحادی مرکز کے نہ ہونے کے اپنی شخصیت کو کسی دن کھو بیٹھے گا اور گرد و پیش

کی ان قوموں میں سے کسی ایک قوم میں ضم ہو جائے گا جس میں اس کی نسبت زیادہ قوت و جان ہو گی۔

لیکن ہندوستان میں اسلامی یونیورسٹی کا قائم ہونا ایک اور لحاظ سے بھی نہایت ضروری ہے۔ کون نہیں جانتا کہ ہماری قوم کے عوام کی اخلاقی تربیت کا کام ایسے علما اور واعظ دے رہے ہیں جو اس خدمت کی انجام دہی کے پوری طرح سے اہل نہیں ہیں۔ اس لئے کہ ان کا مبلغ علم اسلامی تاریخ اور اسلامی علوم کے متعلق نہایت ہی محدود ہے۔ اخلاق اور مذہب کے اصول و فروع کی تلقین کے لئے موجودہ زمانہ کے واعظ کو تاریخ اقتصادیات اور عمرانیات کے حقائق عظیمہ سے آشنا ہونے کے علاوہ اپنی قوم کے لٹریچر اور تخیل میں پوری دسترس رکھنی چاہیئے۔ الندوہ، علی گڑھ کالج، مدرسہ دیوبند اور اس قسم کے دوسرے مدارس جو الگ الگ کام کر رہے ہیں اس بڑی ضرورت کو رفع نہیں کر سکتے۔ ان تمام بکھری ہوئی تعلیمی قوتوں کا شیرازہ بند ایک وسیع تر اغراض کا مرکزی دارالعلوم ہونا چاہیئے جہاں افراد قوم نہ صرف خاص قابلیتوں کا نشوونما دینے کا موقع حاصل کر سکیں بلکہ تہذیب کا وہ اسلوب یا سانچہ تیار کیا جا سکے جس میں زمانہ موجودہ کے ہندوستانی مسلمانوں کو ڈھالنا چاہیئے۔ پس یہ امر قطعی طور پر ضروری ہے کہ ایک نیا مثالی دارالعلوم قائم کیا جائے جس کی مسند نشین اسلامی تہذیب ہو اور جس میں قدیم و جدید کی آمیزش عجب دل کش انداز سے ہوئی ہو۔ اس قسم کی تصویر مثالی کھینچنا آسان کام نہیں ہے۔ اس کے لئے اعلیٰ تخیل، زمانے کے رجحانات کا لطیف احساس اور مسلمانوں کو تاریخ اور مذہب کے مفہوم کی صحیح تعبیر لازمی ہے۔

اس بحث کے خاتمہ سے پہلے میں مسلمان عورتوں کی تعلیم کے متعلق چند

کلمات کہنا ضروری سمجھتا ہوں، اسلام میں عورتوں کا جو درجہ ہے اس پر تفصیلی رائے زنی
کرنے کی یہاں گنجائش نہیں البتہ کھلے کھلے لفظوں میں اس امر کا اعتراف میں ضرور کروں گا
کہ بلحوائے آیہ کریمہ الرجال قوامون علی النساء میں مرد اور عورت کی مساواتِ
مطلق کا حامی نہیں ہو سکتا۔ یہ ظاہر ہے کہ قدرت نے ان دونوں کے تفویض جُدا جُدا
خدمتیں کی ہیں اور ان فرائض جُداگانہ کی صحیح اور باقاعدہ انجام دہی خانوادہ انسانی
کی صحت اور فلاح کے لئے لازمی ہے۔ مغربی دنیا میں جہاں نفسی نفسی کا ہنگامہ گرم ہے
اور غیر معتدل مسابقت نے ایک خاص قسم کی اقتصادی حالت پیدا کر دی ہے۔ عورتوں
کا آزاد کر دیا جانا ایک ایسا تجربہ ہے جو میری دانست میں بجائے کامیاب ہونے کے
اُلٹا نقصان رساں ثابت ہوگا اور نظامِ معاشرت میں اس سے بے حد پیچیدگیاں واقع
ہو جائیں گی اور عورتوں کی اعلیٰ تعلیم سے بھی جس حد تک کہ افرادِ قوم کی شرحِ ولادت کا
تعلق ہے، جو نتائج مرتب ہوں گے، وہ بھی غالباً پسندیدہ نہ ہوں گے۔ مغربی دنیا میں
جب عورتوں نے گھر کی چار دیواری سے باہر نکل کر کسبِ معاش کی جدوجہد میں مرد کا
ساتھ دینا شروع کیا تو خیال کیا جاتا تھا کہ ان کی یہ اقتصادی حریت دولت کی پیداوار
میں معتدبہ اضافہ کرے گی لیکن تجربہ نے اس خیال کی نفی کر دی اور ثابت کر دیا کہ اس
خاندانی وحدت کے رشتہ کو جو بنی نوع انسان کی روحانی زندگی کا جزوِ اعظم ہے، یہ
حریت توڑ دیتی ہے۔

میں اس حقیقت کے اعتراف کے لئے آمادہ ہوں کہ زمانہ حال میں کسی جماعت
کا محض مقامی قوتوں کے ذریعہ سے نشوونما پانا محال ہے۔ ریل اور تار نے زمان و
مکان کے پردہ کو درمیان سے اٹھا سا دیا ہے اور دنیا کی مختلف قومیں جن میں پہلے

بُعدالمشرقین حائل تھا، اب پہلو بہ پہلو بیٹھی ہوئی نظر آتی ہیں اور اس ہم نشینی کا نتیجہ یہ ہونے والا ہے کہ بعض قوموں کی حالت بدل کر رہ جائے گی اور بعض قومیں بالکل ہی ملیامیٹ ہو جائیں گی۔ جو عظیم الشان اقتصادی، عمرانی اور سیاسی قوتیں اس وقت دنیا میں اپنا عمل کر رہی ہیں اُن کے نتائج کے بارے میں کوئی شخص پیشین بندی کی راہ سے رائے زنی نہیں کر سکتا، لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ گو کسی قوم کے لئے بغرض تکمیل صحت اپنی تمدنی آب وہوا کی تبدیلی کے طور پر کسی غیر قوم کے تمدن کے عناصر کا اخذ وجذب کرنا قرینِ مصلحت بلکہ لازمی ہی کیوں نہ ہو لیکن اگر اغیار کی تقلید میں شتابزدگی اور بے سلیقگی سے کام لیا گیا تو نظامِ قومی کے اعضائے رئیسہ میں اختلال عظیم کے پیدا ہونے کا خطرہ ہوگا۔ اقوام کے تمدن میں ایک پہلو عمومیت کا ہوا کرتا ہے لیکن ان کی معاشرت کی رسموں اور سیاسی دستوروں میں خصوصیت شخصی کی شان نظر آتی ہے۔ یہ رسوم اور یہ دستورات ان قوموں کی تاریخی زندگی اور ان کی خاص روایات سے اثر پذیر ہوتی ہیں۔ پس اپنی قوم کی خاص نوعیت، اسلام کی تعلیم اور عالم نسواں کے متعلق علم الاعضا اور علم الحیات کے انکشافات کو مدنظر رکھنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتے کہ مسلمان عورت کو جماعت اسلامی میں بدستور اسی حد کے اندر رہنا چاہیے جو اسلام نے ان کے لیے مقرر کر دی ہے اور جو حد کہ اس کے لیے مقرر کی گئی ہے اسی کے لحاظ سے اس کی تعلیم ہونی چاہیے۔

میں نے سطور بالا میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہماری جماعت کا شیرازہ اس وقت تک بندھا رہ سکتا ہے جب تک کہ مذہب اسلام اور تہذیب اسلام کو ہم پر قابو ہے۔ چونکہ عورت کے دل ودماغ کو مذہبی تخیل کے ساتھ ایک

خاص مناسبت ہے۔ لہٰذا قومی ہستی کی مسلسل بقا کے لئے یہ بات نہایت ضروری ہے کہ ہم اپنی عورتوں کو ابتدا میں خصوصاً مذہبی تعلیم دیں۔ جب وہ مذہبی تعلیم سے فارغ ہو چکیں تو اُن کو اسلامی تاریخ، علم تدبیر، خانہ داری اور علم اصول حفظِ صحت پڑھایا جائے۔ اس سے ان کی دماغی قابلیتیں اس حد تک نشوونما پا جائیں گی کہ وہ اپنے شوہروں سے تبادلۂ خیالات کر سکیں گی اور امومت کے وہ فرائض خوش اسلوبی سے انجام دے سکیں گی جو میری رائے میں عورت کے فرائض اوّلین ہیں۔ تمام وہ مضامین جو ان کی نسائیت کی نفی کرنے یا اسلام کی حلقہ بگوشی سے انہیں آزاد کرانے والے ہیں باحتیاط ان کے نصاب تعلیم سے خارج کر دینے چاہئیں۔ لیکن ہمارے نکتہ آموز ابھی تک اندھیرے میں رستہ ٹٹولتے پھرتے ہیں۔ انہوں نے ابھی تک ہماری لڑکیوں کے لئے کوئی خاص نصاب تعلیم معیّن و مرتب نہیں کیا اور ان میں سے بعض بزرگواروں کی آنکھیں تو مغربی تصورات کی روشنی سے ایسی چندھیا گئی ہیں کہ وہ ابھی تک اسلام میں جو قومیت کو ایک خاص ذہنی کیفیت یعنی مذہب پر منحصر قرار دیتا ہے اور مغربیت میں جس نے قومیت کا محل اور ایک خارجی مواد یعنی وطن کی بنیاد پر تعمیر کیا ہے کوئی فرق نہیں سمجھ سکے۔

اب میں چند خیالات اپنی قوم کے غربا کی عام حالت کی اصلاح کے متعلق ظاہر کرتا ہوں۔ اس ضمن میں عام طبقہ کے مسلمانوں کی اقتصادی حالت سب سے پہلے ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ یقیناً کسی کو اس بات سے انکار نہ ہوگا کہ غریب مسلمان کی اقتصادی حالت نہایت ہی افسوس ناک اور قابل رحم ہے۔ شہروں میں جہاں کی آبادی کا جزوِ غالب مسلمان ہیں معمولی درجہ کے مسلمانوں کی قلیل اُجرت، غلیظ مکان اور

ان کے پیٹ بھر روٹی کو ترستے ہوئے بچوں کا حسرت ناک نظارہ کس نے نہیں دیکھا۔ لاہور کے کسی اسلامی محلہ میں جانکلو ایک تنگ و تاریک کوچہ پر تمہاری نظر پڑے گی جس کے وحشت زا سکوت کے طلسم کو رہ رہ کر یا تو لاغر و نیم برہنہ بچوں کی چیخ و پکار یا کسی پردہ نشین بڑھیا کی لجاجت آمیز صدا توڑتی ہو گی جس کی سوکھی اور مرجھائی ہوئی انگلیاں برقع میں سے نکل کر خیرات کے لئے پھیلی ہوئی ہوں گی۔ یہ تو گلی کی حالت تھی' الم زدہ گھروں کے اندر جاکر دیکھو تو صدہا مرد اور عورتیں ایسی پاؤ گے جنہوں نے کبھی اچھے دن دیکھے تھے لیکن آج فاقہ کر رہی ہیں۔ کئی دن سے اناج کا ایک دانہ تک منہ میں اڑ کر نہیں گیا۔ لیکن غیرت اور خودداری اجازت نہیں دیتی کہ خیرات کے لئے کسی کے آگے ہاتھ پھیلائیں۔ ہمارے نوجوان علم برداران اصلاح تمدن جو پردہ کی رسم کو ہماری قوم کے قویٰ کے روز افزوں انحطاط کا باعث قرار دینے کے عادی ہیں۔ شاید یہ نہیں جانتے کہ اس انحطاط کا اصلی ذمہ دار پردہ نہیں بلکہ یہ جان فرسا افلاس ہے جو ہماری قوم کے ادنیٰ و اقاصی کو کھائے جا رہا ہے۔ علاوہ اس افلاس زدہ طبقہ کے ایک اور طبقہ ان نکمے اور نکھٹو افراد کا ہے جو اپنے جیسی ناکارہ اولاد پیدا کر کے سستی اور کاہلی اور بداعمالی و سیہ کاری کی زندگی خود بھی بسر کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی اپنا سا بنا لیتے ہیں۔ کیا ہم نے تمدنی عقدہ کے ان پہلوؤں پر بھی کبھی نظر ڈالی ہے؟ کیا ہم نے کبھی اس بات کو محسوس کیا ہے کہ ہماری انجمنوں اور مجلسوں کا فرض یہ نہیں ہے کہ خاص خاص اشخاص کی کلاہ اعزاز و افتخار میں بیٹھے ہوئے طرے لگایا کریں، بلکہ یہ ہے کہ عام مسلمانوں کی سطح کو اونچا کریں۔

سب سے زیادہ اہم عقدہ اس مسلمان کے سامنے جو قومی کام کے لئے

اپنے آپ کو وقف کرتا ہے یہ ہے کہ کیونکہ اپنی قوم کی اقتصادی حالت کو سدھار لے
اس کا یہ فرض ہے کہ ہندوستان کی عام اقتصادی حالت پر نظر غائر ڈال کر ان اسباب
کا پتہ لگائے جنہوں نے ملک کی یہ حالت کر دی ہے اس کا یہ فرض ہے کہ کسی اور مسئلہ
پر غور کرنے سے پہلے یہ دریافت کرے کہ ملک کی عام اقتصادی حالت میں کس حد
تک ان بڑی بڑی اقتصادی قوتوں نے حصہ لیا ہے جو آج کل کی دنیا میں اپنا عمل کر
رہی ہیں۔ کس حد تک اہل ملک کی تاریخی روایات، عادات اور مام اور اخلاقی کمزوریوں
نے حصہ لیا اور اگر گورنمنٹ کے طرز عمل کا بھی اس میں کوئی حصہ ہے تو وہ کس حد
تک ہے؟ جو شخص اس گتھی کو سلجھانے کا بیڑا اٹھائے اُسے چاہیئے کہ مذہب
و ملت کے اختلاف کی طرف سے مطلقاً خالی الذہن ہو جائے اور کسی ایک جماعت
کی طرف داری یا پاسداری کے خیال کو اپنے پاس پھٹکنے نہ دے۔ اس لئے کہ اقتصادی
قوتیں تمام قوموں پر اپنا عمل یکساں کرتی ہیں۔ شرح مالگذاری کا آئے دن کا اضافہ، مسکرات
ممالک غیر کی اس ملک میں درآمد، قیمت اجناس کی گرانی (خواہ اس گرانی کا باعث
یہ ہو کہ سکہ رائج الوقت کے متعلق حکومت کے قائم کئے ہوئے اصول غلط ہیں یا یہ
کہ ایک زراعتی ملک اور ایک صنعتی ملک کے درمیان آزاد تجارت کا سلسلہ قائم کر
دیا گیا ہے یا کوئی اور سبب ہو) یہ تمام امور ایسے ہیں جو مسلمانوں، ہندوؤں، سکھوں اور
پارسیوں کی اقتصادی حالت پر یکساں مؤثر ہو کر نہایت بلند آہنگی سے منادی کر رہے
ہیں کہ مختلف جماعتوں کے اہل الرائے اور مقتدا اگر اور باتوں میں نہیں تو اقتصادیات
میں ضرور آپس میں سر جوڑ کر مشورہ کر سکتے ہیں اور ملک کی مشترکہ فلاح کی تدابیر پر غور کر
سکتے ہیں۔ لیکن مسلمان پیشوایان قوم نے اب تک اپنی تمام توجہ اسی مسئلہ پر صرف کئے

رکھی ہے کہ سرکاری نوکریاں ہم لوگوں کو بہ حصہ رسدی ملتی رہیں - یہ کوشش بجائے خود ضرور قابل ستائش ہے اور تاوقتیکہ مسلمانوں کو اپنے مقصد میں کامیابی نہ ہو، ہمارے سربرآوردگان ملت کو برابر اس کوشش میں سرگرمی کے ساتھ مصروف رہنا چاہیئے لیکن ساتھ ہی یہ بات بھی انہیں مدنظر رکھنی چاہیئے کہ دولت کی پیداوار کا ذریعہ ہونے کے لحاظ سے سرکاری ملازمت ایک نہایت ہی محدود ذریعہ ہے - سرکاری ملازمت محدود ہے - چند اشخاص کو ضرور آسودہ اور خوش حال بنا دیتی ہے لیکن قوم کے تمام افراد اس صورت میں آسودہ اور خوشحال ہو سکتے ہیں جب کہ ان کو اقتصادی آزادی نصیب ہو - اس میں بھی شک نہیں کہ اگر کسی قوم کے چند افراد حکومت کے اعلیٰ مناصب پر فائز ہوں تو اس قوم کی عزت اور خودداری میں چار چاند لگ جاتے ہیں لیکن ساتھ ہی یہ بھی صحیح ہے کہ اقتصادی سرگرمی کے اور بہت سے اصناف ایسے ہیں جو اہمیت اور سودمندی میں سرکاری ملازمت کے تگ بھگ ہیں - جس قوم کو اپنے اسلاف سے سپاہیانہ روایات ترکہ میں پہنچی ہوں - اس کے لیے سپہ گری کے تصورات کو چھوڑ کر تجارت اور صنعت وحرفت کی ڈگر پر چلنا یقیناً تکلیف دہ ہے - لیکن چونکہ مغربی اقوام کی دیکھا دیکھی ایشیا کی تمام قوموں کی اقتصادی حالت تغیر پذیر ہوتی جاتی ہے - لہٰذا یہ کڑوی دوا تو دلنی ہی پڑے گی - علاوہ ان اقتصادی مشکلات کے رفع کرنے کے جو ہماری سنگ راہ ہیں - ہمیں صنعتی تعلیم پر بھی ضرور اپنی توجہ صرف کرنی چاہیئے - جو میری رائے میں اعلیٰ تعلیم سے بھی زیادہ ضروری ہے - صنعتی تعلیم سے عامہ خلائق کی اقتصادی حالت سدھرتی ہے اور یہی طبقہ قوم کے لئے بمنزلہ ریڑھ کی ہڈی کے ہے - بخلاف اس کے اعلیٰ تعلیم صرف اُن چند افراد کو نفع پہنچاتی ہے جن کی دماغی قابلیت درجۂ اوسط

سے بڑھی ہوئی ہوتی ہے۔ ہمارے اخبار کے بدل وجود کا مصرف ایسا ہونا چاہیئے
کہ عام مسلمانوں کے بچے ارزاں صنعتی تعلیم حاصل کر سکیں۔ لیکن صنعتی اور تجارتی تعلیم
بلا کسی اخلاقی تربیت کے بجائے خود کافی و مکتفی نہیں ہے۔ اقتصادی مقابلہ میں تربیت
کے اخلاقی عنصر کی کچھ کم ضرورت نہیں پڑتی۔ اعتماد باہمی، دیانتداری، پابندی اوقات
اور تعاون وہ اقتصادی اوصاف ہیں جو مہارت فن کی برابر کی جوڑ ہیں۔ ہندوستان
میں بہت سے کارخانے محض اس لیے نہ چل سکے کہ کارخانہ داروں کو نہ ایک دوسرے
پر بھروسہ تھا اور نہ اصول امداد باہمی ان کا رہنما تھا۔ اگر ہم اچھے کاریگر اچھے دکاندار
اچھے اہل حرفہ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اچھے شہری پیدا کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں
چاہیے کہ انہیں اوّل پکا مسلمان بنائیں۔